مَلاكُ التأوِيل

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

تمہید

قرآن مجید کی خدمت مختلف انداز میں کی گئی ہے۔ قراءت، تجوید، تفسیر، ربطِ آیات کی شکل میں علومِ قرآن کا ایک وسیع باب قُرّاء اور علماء کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے۔ بعض اہل علم نے اس پہلو کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک ہی آیت کتاب اللہ میں دو مرتبہ یا کئی مرتبہ بیان ہوئی ہے، لیکن یا تو ان آیات میں ایک دو حرف یا الفاظ کی بنا پر اختلاف واقع ہوا ہے یا آیت کے الفاظ تو وہی ہیں لیکن سیاق وسباق کے اختلاف کی بنا پر ہر جگہ نئے معانی ومطالب اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے بہتر اور جامع کتاب ''مَلاكُ التأويل'' ہے جس کے مصنف اُندلس کے ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی ہیں جن کا سن وفات ۷۰۸ھ ہے۔ کتاب کا پورا نام ہے:

ملاك التأويل القاطع بذوى الالحاد والتعطيل فى توجيهه المتشابه اللفظ من آى التنزيل

صاحبِ کتاب مقدمۃ الکتاب میں لکھتے ہیں:

''میں جس فن کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں، وہ تغافلِ زمانہ کا شکار رہا ہے۔ مراد اس فن سے یہ ہے کہ اگر ایک آیت قرآن میں تکرار کے ساتھ بیان ہوئی ہو، یا آیت کے الفاظ میں تقدیم وتاخیر ہو یا کوئی کلمہ زائد ہو تو اس کی وجہ سے معانی ومطالب میں کیا فرق واقع ہوتا ہے۔

اس فن میں بہت کم لکھا گیا ہے، حالانکہ ملحد اور کم فہم لوگ اس بنا پر اعتراضات کرتے نظر آتے ہیں۔ مجھے علمائے شرق میں سے ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب الاسکافی (وفات: ۴۲۰ھ) کی کتاب ''درّةُ التنزيل وغُرّة التأويل'' ہاتھ لگی جس میں اس فن کی باریکیوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں نے جو کچھ اپنی کتاب میں لکھا ہے وہ اپنے فہم اور تدبّر کی بنا پر لکھا ہے اور پھر اس کا الاسکافی کی کتاب سے موازنہ کیا ہے۔ وہ کئی مقامات کو چھوڑتے گئے ہیں، جنہیں میں نے پُر کیا ہے یا ان کی تحریر میں اضافہ کیا ہے۔ ایسے مقامات پر میں نے حرف ''غ'' درج کر کے تنبیہ کر دی ہے۔ (غ سے مراد یہ ہے کہ اِسکافی اس مقام سے غافل رہے ہیں) اور اس لحاظ سے میں یہ دعویٰ کرنے میں حق بہ جانب ہوں کہ اس موضوع پر یہ کتاب اس فن کی ایک بے نظیر کتاب ہے۔

صاحبِ ملاک التاویل کے سوانح حیات

اب صاحبِ کتاب کی سوانح کا مختصر بیان ہو جائے:

ابن الزبیر کی ولادت کا سال ۶۲۷ھ ہے۔ اندلس کے شہر جیان میں پیدا ہوئے۔ ۶۴۳ھ میں جب کہ ان کی عمر سولہ سال تھی، ان کے والد اس شہر پر دشمن کے قبضے کی بنا پر ''مالقہ'' ہجرت کر گئے، جہاں ابن الزبیر نے علمائے وقت کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ تحصیل علم کے بعد انہوں نے درس و تدریس کا آغاز کیا، جس میں کتاب اللہ کو قراءت کے ساتھ پڑھانا، حدیث کو سننا اور سنانا، عربی زبان کا پڑھانا اور فقہ کی تعلیم شامل تھی۔ حدیث میں خصوصی مہارت کی بنا پر محدثِ اندلس کہلائے۔ ان کے شاگرد ابوحیان اندلسی اپنی کتاب ''النضّار'' میں لکھتے ہیں:

> ''ابن الزبیر تھے ایک جلیل القدر محدث، نقاد، نحوی، ماہر اصول فقہ، خطاط، معلم قراءتِ قرآن، مفسّر اور مؤرخ۔ نہ صرف مالقہ بلکہ غرناطہ اور دوسرے شہروں میں قرآن، حدیث اور نحو کی تعلیم دیتے رہے۔ فن قراءت کا خاص خیال رکھتے۔ جس وقت مالقہ چھوڑا ہے، ان کے چار طلبہ نحو کے استاذ سیبویہ کی کتاب پڑھ رہے تھے۔''

ابن الخطیب نے ان کی زندگی کے ایک دوسرے پہلو کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

> ''خشوع اور خشیت کا ان پر غلبہ تھا، زبان میں روانی تھی، حق کہنے میں بے باک تھے، اہلِ بدعت کے لیے ننگی تلوار تھے، سنت کے شیدائی تھے، عوام و خواص میں قدر و منزلت کے حامل تھے، مجلسی زندگی میں ظرافت اور نُدرت کا عنوان تھے، اور اس ضمن میں ان سے بہت سی حکایات منسوب ہیں جن میں وقار اور متانت ملحوظِ خاطر ہیں۔''

حق بات کہنا ان کے لیے آزمائش کا سبب بن گیا۔ مالقہ میں ابراہیم نامی ایک شخص عجیب و غریب عادات کا مالک تھا، خارقِ عادت اعمال کا دعویٰ کرتا تھا، مستقبل کی باتیں لوگوں کو بتا کر اپنی کرامت کا سکّہ جمانے کی کوشش کرتا تھا۔ مالقہ میں اس وقت بنی اشقیلولہ کا ایک شخص، زبردستی امارت پر قابض ہو چکا تھا۔ ابن الزبیر نے جب اس کے فریب اور دجل کو آشکار کرنا شروع کیا تو اس نے امیر مالقہ سے شکایت کی۔ ابن الزبیر نے مالقہ سے چلے جانے میں عافیت سمجھی، ان کے جاتے ہی ان کی رہائش گاہ کو لوٹ لیا گیا، ان کی بیش قیمت کتابیں، شیوخ سے اخذ کردہ قیمتی نکات پر مشتمل تحریریں، سب کی سب ضائع ہو گئیں۔ ابن الزبیر نے غرناطہ کے امیر ابوعبداللہ بن الأمیر الغالب باللہ بن نصر کے ہاں پناہ لی جس نے انہیں قدر و منزلت کے ساتھ اپنے دربار میں جگہ دی۔

یہی وہ زمانہ ہے جب ابن الزبیر نے اپنی یہ کتاب تصنیف کی اور اسے مذکورہ امیر المسلمین بن امیر المسلمین کی طرف منسوب کیا، لیکن حالات کے بدلنے میں دیر نہ لگی اور ان کے ایک پڑوسی کی چغلی کی بنا پر وہ نشانۂ عتاب بنے، انہیں اپنے ہی گھر میں محبوس کر دیا گیا، ایک طویل عرصہ کے بعد گھر کی قید سے چھٹکارا ملا، اور اس عرصہ میں مالقہ کی امارت امیر ابی عبداللہ بن نصر کے ہاتھ آ گئی اور ابن الزبیر کو دوبارہ انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ اب یہ موقع تھا کہ ابن زبیر مالقہ کے دجال ابراہیم النفراری کا پردہ چاک کریں۔ امیر کی ہدایت پر اہالیان شہر میں سے چند لوگوں کے مطالبہ پر اسے گرفتار کر لیا گیا، اس کے عقائد اور شعبدہ بازیوں کی چھان بین کی گئی اور پھر سزائے موت سنائی گئی۔ جب حد نافذ کرنے کا وقت آیا اور اس پر تلوار کا وار کیا گیا تو تلوار نے کام نہیں کیا۔ ابن الزبیر نے کہا کہ اس کے کپڑے اُتارے جائیں، دیکھا گیا کہ اس کے بدن پر تعویذات قسم کی تحریر مکتوب ہے۔ چنانچہ یہ

سب کچھ دھو دیا گیا' اس کی زبان کے نیچے ایک ننھی سی کنکری پائی گئی جو نکال دی گئی' اور پھر تلوار اپنا کام کر گئی۔

ان کے ایک مشہور شاگرد ابوحیان نحوی (مصنف کتاب البَحر المُحِیط) ان کی شان کے بارے میں یوں رطب اللسان ہیں:

''ابن الزبیر نہ صرف اندلس کے بلکہ سارے مغرب کے محدث تھے' نیک نام اور مخیّر تھے' عوام وخواص میں مقبول تھے' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عامل تھے' کسی کے در پر ہاتھ پھیلانے والوں میں سے نہ تھے اور اسی وجہ سے شاہوں اور امراء کے معتوب رہے' حق کہنے کی پاداش میں تنگی دیکھی اور محبوس بھی رہے' لیکن صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ بہت عرصہ غرناطہ کی جامع مسجد کے امام وخطیب رہے' فتویٰ نویسی سے بھی اشتغال رہا' نکاح خوان بھی تھے' درس وتدریس کا طویل سلسلہ رہا اور ان کے بے شمار شاگردوں کی بنا پر ان کا علم اگلی نسلوں میں منتقل ہوتا رہا۔''

ابن الزبیر کے شیوخ کی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے' تلامذہ کی تعداد اس سے زیادہ ہے جن میں ابوحیان نحوی' ابن الزیات اور ابن الحاج جیسے فضلاء نظر آتے ہیں۔

تصنیفات کی تعداد بارہ کے قریب ہے جس میں ''البرهان في ترتيب سُور القرآن'' اور ''ملاك التأويل'' سرفہرست ہیں۔ مذکورہ کتاب مصر کے ڈاکٹر محمود کامل احمد کی تحقیق کے ساتھ دو جلدوں میں ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی ہے۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد ہم اصل کتاب کی تلخیص اور ترجمانی کا بیڑا اٹھاتے ہیں' اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ ہمیں اس کارِ عظیم کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

صہیب بن عبدالغفار حسن
نزیل لندن۔ برطانیہ

سورۃ اُمّ القرآن (الفاتحہ)

پہلی آیت (غ): اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

سورۂ فاتحہ اُمّ القرآن ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے پہلی سورت ہے۔ تمام امور کے آغاز واختتام پر اللہ تعالیٰ کی حمد (تعریف وتوصیف) ایک ثابت شدہ امر ہے۔ خود کتاب اللہ میں کئی سورتوں کے آغاز واختتام پر حمد کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو ہدایت دی: ﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ (الاسراء: ۱۱۱)

قرآن میں اکثر جگہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' ہی وارد ہے' لیکن سورۃ الجاثیہ (آیت ۳۶) میں ''فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ'' کہا گیا اور ہر جگہ ان الفاظ کے بعد اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات کو بیان کیا گیا۔

یہاں ایک سائل چار سوال کر سکتا ہے۔

پہلا سوال: سورۃ الفاتحہ اور دوسری کئی سورتوں میں وارد ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' اور سورۃ الجاثیہ میں وارد ''فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ'' میں کیا فرق ہے؟

دوسرا سوال: ان پانچ سورتوں: الفاتحہ‘ الانعام‘ الکہف‘ سبا‘ فاطر کا آغاز ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ‘‘ سے ہوا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے جبکہ ان میں سے ہر ایک سورت اپنے مضمون کے اعتبار سے اپنا امتیازی وجود رکھتی ہے۔

تیسرا سوال: ان سورتوں میں ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ‘‘ کے بعد ہر سورت میں اللہ تعالیٰ کے مختلف اوصاف بیان ہوئے ہیں‘ جیسے:

سورۃ الفاتحہ میں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝﴾

سورۃ الانعام میں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ؕ﴾

سورۃ الکہف میں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ﴾

سورۃ سبا میں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾

سورۃ فاطر میں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾

تو کیا ان اوصافِ باری تعالیٰ کی ہر سورت کے ساتھ خاص مناسبت ہے جو دوسری سورت میں پائی نہیں جاتی؟

چوتھا سوال: کیا وجہ ہے کہ جس طرح مذکورہ سورتوں میں ’’اَلْحَمْدُ‘‘ سے ابتدا کرتے ہی ہر سورت میں مختلف صفاتِ باری تعالیٰ بیان ہوئیں‘ لیکن جہاں جہاں سورت کے اختتام میں یہ آیت آئی ہے وہاں ایک ہی اسلوب کے ساتھ سورت کا اختتام ہو رہا ہے؟ جیسے:

سورۃ الانعام میں کہا گیا: ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝۴۵﴾

سورۂ یونس میں ارشاد ہوا: ﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰىہُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝۱۰﴾

سورۃ الزمر میں کہا گیا: ﴿وَقُضِیَ بَیْنَہُمْ بِالْحَقِّ وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝۷۵﴾

اور سورۃ الصافات کا یوں اختتام ہوا: ﴿وَسَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ۝۱۸۱ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝۱۸۲﴾

پہلے سوال کا جواب

پہلے سوال میں جواباً عرض ہے کہ:

’’اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ‘‘ عربی نحو کے اعتبار سے مبتدأ اور خبر ہے۔

’’وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ‘‘ میں خبر کو پہلے ذکر کیا گیا اور مبتدأ کو بعد میں اور عربی مسلمہ قواعد کے اعتبار سے مبتدأ کو پہلے ذکر کیا جانا چاہیے اِلا یہ کہ اسے مؤخر کرنے اور خبر کو مقدم کرنے کا خاص کوئی سبب ہو۔

سورۃ الجاثیہ میں خبر کو مقدم رکھا گیا ہے اور ہم یہاں یاد دلاتے چلے جائیں کہ تقدیم و تاخیر کا تعلق صرف لفظی ترکیب کے ساتھ ہی نہیں بلکہ معانی و مطالب کے ساتھ بھی ہے۔

’’وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ‘‘ گویا ایک سوال کا جواب ہے اور وہ اس طرح کے پہلے اللہ کو جھٹلانے والوں کا انجام بتایا گیا ہے۔ انبیاء و رسلؑ نے جیسے جیسے مکذبین کو خبردار کیا تھا‘ اس کے مطابق واقعات کو انجام پذیر ہوتا دکھائی دیا گیا ہے اور پھر یہ سوال اٹھایا گیا: اب بتاؤ کہ حمد کا مستحق کون ہے؟

اور اس سلسلے کی دوسری آیت ہے: ﴿لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ؟﴾ ’’آج بادشاہت کس کی ہے؟‘‘ پھر خود ہی

جواب دیا: ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ⑯﴾ (غافر) ''اللہ کے لیے جو واحد ہے قہر والا ہے۔''

اب ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ دونوں مقامات کتنے مشابہ ہیں:

سورۂ غافر (یا سورۃ المؤمن) میں پہلے ارشاد ہوا:

﴿لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ⑮ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۭ﴾

''تاکہ وہ ملاقات کے دن سے خبردار کردے' وہ دن جبکہ سب لوگ بے پردہ ہوں گے' اللہ سے ان کی کوئی بات بھی چھپی ہوئی نہ ہوگی۔''

یعنی اب جبکہ ہر چیز ظاہر ہوگئی ہے اور جو بات پہلے خبر تھی اب مشاہدے میں آ گئی ہے تو پھر یہ سوال اٹھایا گیا:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ؟﴾ ''آج بادشاہت کس کی ہے؟''

سورۃ الجاثیہ میں پہلے یہ الفاظ آئے:

﴿وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا﴾ (آیت ۳۳)

''اور ان کے اعمال کی برائیاں ان پر ظاہر ہوگئیں۔''

یہ دن وہی ملاقات کا دن ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی۔ اب جبکہ تمام حقیقت ظاہر ہو چکی' شکوک اور شبہات کے بادل چھٹ گئے تو گویا ان سے سوال ہوا: اب بتاؤ کہ تمام تعریفوں کا مستحق کون ہے؟ اور قدرتی طور پر جواب دیا گیا: ''فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ'' اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں۔

اور خیال رہے کہ جواب کی روشنی میں سوال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے چاہے اس کا ذکر نہ کیا گیا ہو' یعنی وہ سوال جس کا ہم یہاں مفروضہ اختیار کر رہے ہیں' وہ اتنا واضح ہے کہ وہ ایسے ہی ہے جیسے وہ سوال جس کا ذکر کر دیا گیا ہو۔ اور ایسا اختصارِ کلام کی بنا پر کیا جاتا ہے۔

اب دیکھئے کہ سورۃ المؤمن میں مُلك (بادشاہی) کا ذکر سوال میں موجود تھا: ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ تو جواب میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ صرف کہا: ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○﴾۔ یہ نہیں کہا: فَلِلّٰهِ الْمُلْك ''بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔

دوسری طرف سورۃ الجاثیہ میں ''الْحَمْدُ'' کا ذکر پہلے نہیں کیا گیا تھا' صرف سیاق وسباق کی بنا پر اس کا اندازہ کیا گیا تھا اس لیے جواباً اس کا ذکر صراحتاً کیا گیا اور کہا گیا: فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔

اس سورت میں مقصود تھا کہ مکذّبین کو ڈانٹا جائے' ان کی سرزنش کی جائے اور اب جبکہ ان کے اپنے دعووں اور تعلّیوں کی قلعی کھل گئی تھی تو پھر نہ صرف یہ کہا گیا کہ اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و ربوبیت کا بھی کھل کر اعلان کیا گیا کہ:

﴿رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ㊱﴾ (الجاثیۃ)

''جو رب ہے آسمانوں کا' رب ہے زمین کا اور رب ہے تمام جہانوں کا۔''

آسمان اور زمین چونکہ اللہ کی بڑی نشانیوں میں سے ہیں' اس لیے ان کا خاص طور پر ذکر کیا۔ سورۂ غافر میں ارشاد ہوا:

﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ﴾ (غافر:۵۷)

''آسمان اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑی بات ہے۔''

چنانچہ سورۃ الجاثیہ میں پہلے اپنی ان دو بڑی نشانیوں کا ذکر کیا اور اس کے بعد رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہہ کر اپنی عمومی ربوبیت کا ذکر کیا۔

''العالم'' سے مراد اللہ کے سوا باقی ساری اس کی مخلوقات ہیں' پھر کہا:

﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾ (الجاثیۃ:۳۷)

''اور اسی کے لیے بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔''

یعنی عظمت' جلال' تخلیق' تدبر سب کا مالک تنہا وہی ہے' وہ عزت والا ہے کہ سب اس کے سامنے سرنگوں ہیں۔ وہ اپنے تمام افعال میں حکمت والا ہے گو ہماری عقلیں اس کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ پاتیں اور نہ انسانی فکر اس کے افعال کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اور چونکہ یہاں مشرکین اور اللہ کے ساتھ غیروں کی پرستش کرنے والوں کی سرزنش مقصود تھی اس لیے اس آیت میں مذکورہ اوصافِ باری تعالیٰ کا طوالت کے ساتھ ذکر کیا گیا' لفظ ربّ کا بار بار اعادہ کیا گیا' برخلاف سورۃ الفاتحہ کے' جہاں مؤمنوں سے خطاب ہے۔ جو لوگ اللہ کو مانتے ہیں ان کی تعلیم مقصود ہے' اس لیے اختصار سے کام لیا گیا اور سورۃ الجاثیہ کی طرح طوالت سے کام نہیں لیا گیا' یعنی دونوں سورتوں میں اسلوبِ بیان کا اختلاف اس سورت کے مضمون کے اعتبار سے ہے۔

دوسرے سوال کا جواب

دوسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ ان پانچ سورتوں کی ابتدا ''اَلْحَمْدُ'' سے کی گئی ہے۔

سورۃ الفاتحہ اُمّ القرآن ہے' قرآن کی پہلی سورت ہے' مطلع قرآن ہے' اس لیے اس کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کا ہونا بالکل واضح ہے۔

سورۃ الانعام میں ثنویہ (دو خداؤں کے قائل) کے مذہب کا ابطال ہے اور ان تمام لوگوں کا جو نور اور ظلمت کے قائل ہیں یا کائنات میں دو فاعلوں کی کارکردگی کو مانتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب ''البرہان'' میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے اور چونکہ اس موضوع کا خاص طور پر اس سورت ہی میں ذکر آیا ہے' اس لیے اس سورت کا آغاز اللہ تعالیٰ کی تعریف سے ہونا قدرتی تھا۔ اس کی مزید وضاحت اگلے سوال کے جواب میں آ رہی ہے۔

سورۃ الکہف میں ایک تو غار والوں کا قصہ ہے' یہودیوں کے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کا جواب ہے جو انہوں نے کفارِ قریش کی زبانی ارسال کیا تھا۔ یہ دونوں باتیں کسی اور سورت میں بیان نہیں ہوئیں' اس لیے اس سورت کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد سے کرنا مناسب تھا۔

سورۂ سبا وہ واحد سورت ہے جس میں قومِ سبا کا تفصیلی قصہ بیان ہوا ہے' ماسوا ایک اشارے کے جو سورۃ النمل میں ذکر ہوا ہے' جہاں ہُدہُد کی زبانی یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾﴾ ''اور میں سبا سے ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں''۔ اور اس سورت میں اس قصے کے علاوہ داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو جو خصوصیات دی گئی تھیں ان کا خاص طور پر ذکر ہوا ہے جیسے ان کے لیے پہاڑوں کا مسخر کیا جانا' پرندوں کی زبان کا

سمجھنا' جنات کی تسخیر اور لوہے کا پگھلایا جانا' یہ سب باتیں کسی اور سورت میں بیان نہیں ہوئیں' اس لیے اس سورت کی ابتدا احمد باری تعالیٰ سے ہوئی کہ وہ آسمان اور زمین کی بادشاہت کا حامل ہے اور وہی دنیا اور آخرت میں قابلِ ستائش ہے۔

سورۂ فاطر میں فرشتوں کی پیدائش' ان کے بے شمار پر ہونے اور پیغامبر ہونے کا خصوصی تذکرہ ہے' آسمان و زمین کی خلقت' انہیں تھامے رکھنے اور زائل ہونے سے بچانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ باتیں کسی اور سورت میں بیان نہیں ہوئیں اس لیے اس سورت کا بھی حمدِ باری تعالیٰ سے شروع کیا جانا مناسب ہوا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں کہیں کسی سورت میں صرف ایک ہی مضمون بیان ہوا ہو وہاں حمد باری تعالیٰ کا ہونا ضروری ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ہونا جائز ہے' لیکن ان پانچ سورتوں کی حمد کے ساتھ انفرادیت بھی واضح ہے۔

تیسرے سوال کا جواب

اُمّ الْقُرآن (الفاتحہ) چونکہ قرآن کی پہلی سورت ہے' آیات میں سب سے پہلی آیات پر مشتمل ہے اور قرآن خود ہر چیز کو واضح طور پر بیان کرنے والا اور اللہ کی وحدانیت کا اعلان کرنے والا ہے اور یہ کہ وہی خالق اور موجد ہے' دونوں دنیاؤں کا مالک ہے اور اس قرآن میں ان دونوں عالَم کے بارے میں ہر چیز کا علم ہے' اس لیے یہ بالکل مناسب تھا کہ اللہ کے ذکر کے بعد اس کے ایسے عالی اوصاف ذکر کیے جاتے جو مندرجہ بالا حقائق کی عکاسی کرتے' یعنی یہ کہ وہی ربّ العالمین ہے' وہی الرحمٰن اور الرحیم ہے' وہی جزا و سزا کے دن کا مالک ہے' اور یہ سب کچھ بتانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ کسی مدعی کے لیے کسی دعویٰ کی گنجائش نہ رہے' حقیقت اظہر من الشّمس ہو کر رہ جائے اور خبر صرف خبر نہ رہے بلکہ ایسی ہو جائے جیسے چشم دید ہو۔

سورۃ الانعام میں چونکہ ان لوگوں کی طرف اشارہ آنے والا تھا جو نور اور ظلمت کے خداؤں پر یقین رکھتے ہیں' خیر کو نور سے اور شر کو اندھیرے سے ماخوذ مانتے ہیں' اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس سورت کا آغاز اس تمہید کے ساتھ کیا کہ وہی آسمان اور زمین کا خالق ہے کہ ان دونوں کا تعلق ان بڑے بڑے سیاروں اور ستاروں کے ساتھ ہے جن کا تعلق اندھیرے یا روشنی سے ہے اور پھر ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ ہی نور کا خالق ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کے ضمن میں ان لوگوں کے مذہب کا رد کیا جو ستاروں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ قصے کا آغاز اس آیت سے ہوتا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (آیت ۷۵)

''اور اس طرح ہم ابراہیم کو آسمان اور زمین کے ملکوت دکھا رہے تھے۔''

پھر کہا:

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ﴾ (آیت ۷۶)

''اور جب رات ہو گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا۔''

پھر انہوں نے اپنی قوم پر حجت قائم کرنے کے لیے مفروضے کے طور پر کہا:

﴿هٰذَا رَبِّیۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِیۡنَ ﴿۷۶﴾﴾

''یہ میرا رب ہے' اور جب وہ ڈوب گیا تو کہا میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

یہی بات پھر چاند اور سورج کے بارے میں بھی کہی۔ استدلال یہ تھا کہ ان دونوں کا طلوع ہونا پھر غروب ہونا بتاتا ہے کہ ان میں ہر آن تغیر اور تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے اور یہی بات اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تو خود کسی کے ہاتھ میں ہیں' کوئی انہیں مسخر کیے ہوئے ہے' یہ تو اپنے موجد کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں جو کہ خود تغیّر و تبدّل سے پاک ہے۔ اور پھر صاف صاف کہہ دیا:

﴿اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ ﴿۷۸﴾﴾

''میں تمہارے شرک سے بریٔ الذمّہ ہوں۔''

اور یہ بھی واضح کر دیا کہ اوّل اور آخر وہ کیا تھے۔ سورۂ آل عمران میں فرمایا:

﴿مَا کَانَ اِبۡرٰہِیۡمُ یَہُوۡدِیًّا وَّلَا نَصۡرَانِیًّا وَّلٰکِنۡ کَانَ حَنِیۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۶۷﴾﴾

''ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی' بلکہ شرک سے بیزار مسلمان تھے' اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔''

اور ان کے اس قول میں کہ ﴿وَمَاۤ کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ﴾ ستاروں کی عبادت کی بالکل نفی ہو گئی۔

اب تو یہ بالکل واضح ہو جانا چاہیے کہ سورۃ الانعام کا آغاز ان جملوں کے ساتھ کیوں ہوا کہ وہی خالق السماوات والارض ہے اور وہی ظلمات اور نور کا پیدا کرنے والا ہے۔

جہاں تک سورۃ الکہف کا تعلق ہے تو اس میں اصحابِ کہف کا قصہ بیان ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کی ملاقات کا بیان ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں بتایا گیا ہے جو زمین کی طنابیں کاٹنے والا تھا' وہاں تک پہنچا کہ جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے اور وہاں بھی جہاں غروب ہوتا ہے۔ پھر اس نے یأجوج اور مأجوج کا راستہ روکنے کے لیے بند بھی باندھ دیا۔ اور یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ عقل سے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ ان کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے تو صرف وحی سے کہ جس میں نہ ٹیڑھ پن ہے' نہ کجی ہے' نہ شک و شبہ کی گنجائش ہے اور نہ گمراہی کی' اس لیے یہ بالکل مناسب تھا کہ اس سورۃ کا آغاز وحی کے ذکر سے کیا جاتا۔ فرمایا:

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ﴿۱﴾﴾

''تعریف اس اللہ کی جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔''

سورۃ الملائکہ (سورۃ فاطر) میں آغاز ہوتا ہے کہ اللہ ہی آسمان و زمین کا بنانے والا ہے' اور وہ اس لیے کہ اس سورت میں آسمان کی اُس مخلوق (فرشتوں) کا ذکر ہے جو آسمانوں کو آباد کیے ہوئے ہیں۔ وہ پر رکھتے ہیں۔ اور پھر اس بات کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو ایسے تھام رکھا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے زائل نہیں ہو سکتے۔ اور ان تمام چیزوں کا ذکر کسی دوسری جگہ اتنا مناسب نہ تھا جتنا اس سورت کے آغاز میں۔ اس وضاحت سے معلوم ہو گیا کہ ان پانچوں سورتوں کا آغاز ان کے سیاق و سباق سے بالکل مناسب تھا۔ واللہ اعلم!

سورۂ سبا میں حضرات داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا ذکر ہے اور کیسے ان کے لیے پہاڑوں، پرندوں' ہوا کو مسخّر کر دیا گیا اور کیسے لوہے کو ان کے لیے نرم کر دیا گیا۔ اس لحاظ سے سورت کے آغاز میں یہ کہنا بالکل مناسب تھا کہ ان

میں ہر چیز کا مالک اللہ ہے' وہی ان کا مسخر کرنے والا ہے اور وہی ان میں جیسے چاہے تصرف کرنے والا ہے۔ فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ (الانعام:۱)

''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس کے لیے ہر وہ شے ہے جو آسمانوں میں ہے یا زمین میں ہے۔''

چوتھے سوال کا جواب

سورتوں اور آیات کے اختتام میں وہ باتیں مقصود نہیں جو کہ آغاز میں مطلوب ہوتی ہیں' بلکہ کسی بھی عمل کے خاتمہ پر یا کسی بھی کام کے انجام کے وقت صرف ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کہنا مشروع قرار دیا گیا ہے اور اس قول میں گویا ایک مؤمن اس بات کا اعتراف کر رہا ہے کہ اللہ ہی خالق ہے' آمر ہے' **مالك الدارین** ہے اور ہر اس وصف کا مستحق ہے جو ان سورتوں میں بیان ہوئے۔ یہاں نہ ڈانٹ ڈپٹ کا موقع ہے اور نہ کسی دھمکی کا' اس لیے صرف ''**الحمد**'' پر اکتفا کیا گیا۔

دوسری آیت :﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۝﴾

یہاں صرف ایک ہی سوال وارد ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ان دو عالی صفات پر مشتمل آیت کو ان دو آیتوں کے درمیان رکھا گیا جو اللہ تعالیٰ کے مالک ہونے پر دلالت کرتی ہیں' یعنی ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝﴾ اور ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ۝﴾ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پہلی آیت جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی گئی ہے کہ وہی عالمین کا رب ہے اور ہر چیز کا مالک ہے' اس آیت سے متصل ''**مالك یوم الدین**'' ہونا چاہیے تھا' تاکہ دونوں عالم کے مالک ہونے کا ذکر ساتھ ساتھ ہو جاتا اور یہ واضح ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق' آمر اور حاکم ہے۔ جیسے سورۃ القصص میں کہا گیا:

﴿لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَةِ﴾ (آیت ۷۰)

''اُسی کے لیے سب تعریفیں ہیں پہلے (عالم) میں بھی اور آخری میں بھی۔''

اس لحاظ سے آیت یوں ہونی چاہیے تھی:

''**الحمد للّٰه ربِّ العالمین' مالك یوم الدین**''

لیکن کیا درمیان میں ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۝﴾ کے ذکر سے قوتِ بیان میں وہ زور باقی رہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو خاص عنایت اور تکریم سے نوازا ہے' فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

''تم وہ بہترین اُمت ہو جو لوگوں (کی ہدایت) کے لیے نکالی گئی ہے''

اور نبی ﷺ کو اولادِ آدمؑ کا سردار اور تمام مخلوقات میں منتخب قرار دیا' اور یہ حقیقت ہے کہ پیروی کرنے والا اپنے مقتدی یا امام کی بنا پر عزت پاتا ہے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ سے خطاب کیا تو انتہائی محبت اور لطافت سے۔ آپ کو ایک غلطی پر متنبہ کرنا تھا لیکن پہلے معاف کرنے کی بات کی اور پھر وہ الفاظ کہے جن سے عتاب ظاہر ہوتا ہے:

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ﴾ (التوبۃ:۴۳)

''اللہ نے تمہیں معاف کیا' تم نے انہیں کیوں اجازت دی؟''

اور یہ اس لیے کیا کہ نبی ﷺ کے قلب مبارک کو تکلیف نہ پہنچے۔ بالکل اسی طرح اس نبی کی امت کے ایمان والوں کے ساتھ یہی مشفقانہ خطاب اختیار کیا کہ جس دن ان کے اعمال اللہ کے حضور پیش کیے جائیں گے تو وہ اللہ کو رحمٰن ورحیم پائیں گے۔ اس لیے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ سے قبل ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کا تذکرہ کر دیا۔ وہ اس لیے کہ یہ دن بڑا سخت دن ہوگا: ﴿اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾﴾ (ابراھیم) ''انہیں اس دن تک کی مہلت دے گا جب کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی''۔ اور فرمایا: ﴿وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَاهُمْ بِسُكٰرٰى﴾ (الحج:۲) ''اور ہر حاملہ اپنے حمل کو گرا دے گی اور لوگ تمہیں مدہوش نظر آئیں گے' حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے''۔ اور اس طرح حساب وکتاب سے قبل رحمت کا ذکر کر کے اس اُمت سے بھی مشفقانہ خطاب کیا جیسے ان کے نبیؐ سے کیا تھا۔

تیسری آیت : ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ)

عاصم اور کسائی کی قراءت میں ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ پڑھا گیا اور دوسری قراءت میں (مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ)۔ سورۂ آل عمران آیت ۲۶ میں کہا گیا:

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾

یہاں صرف یہی ایک قراءت ہے۔ سورۃ الناس میں کہا گیا: ﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾ یہاں بھی صرف یہی ایک قراءت ہے۔ تینوں آیات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اللہ ہی بادشاہ ہے اور وہی مالک ہے۔

لیکن قراءت کے اس اختلاف سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ اختلاف کیوں ہے؟ اور جب کہ تینوں آیات کا مقصود ایک ہی ہے تو اُمّ القرآن (الفاتحہ) کی اس آیت میں دونوں قراءت کا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ حالانکہ یہ بات تو طے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر شے کے مالک بھی ہیں اور اسے وجود عطا کرنے والے بھی ہیں۔ وہ بادشاہ بھی ہیں اور مالک بھی' اور کیا یہ اختلاف اس لیے ہے کہ تینوں آیات کے مقاصد جدا جدا ہیں؟

جواب یہ ہے کہ تینوں آیات کا حاصل تو یہی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ بادشاہ بھی ہے اور مالک بھی۔ اور یہ بات سورۃ الفاتحہ کی اس آیت میں دونوں قراءت سے ظاہر ہوتی ہے' اور سورۂ آل عمران کی آیت میں ﴿مَالِكَ الْمُلْكِ﴾ کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ وہ بادشاہ بھی ہے کیونکہ مُلْك (بادشاہت) کا تعلق بادشاہ ہی سے ہوتا ہے اور اس طرح دونوں صفات (یعنی مَلِك اور مَالِك) ثابت ہو گئیں۔ اور سورۃ الناس میں ''رَبِّ النَّاس'' کہہ کر ''مَالِكِ النَّاسِ'' کہنے کی حاجت نہیں رہی' کیونکہ رب ہی مالک ہوتا ہے' گویا یوں کہا جا رہا ہے:

''قُلْ اَعُوْذُ بِمَالِكِ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ''

''کہہ دیجیے کہہ میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے مالک کی اور لوگوں کے بادشاہ کی۔''

تو ایجاز اور اختصار کی خاطر مالك اور ملك کی تکرار نہیں کی گئی بلکہ ''ربّ'' کے لفظ سے مالک کا مفہوم خود بخود حاصل ہو گیا۔

لیکن سورۃ الفاتحہ کی آیت ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ میں ایک خاص بات کہی گئی ہے جو کہ اس سے پہلی والی

آیت میں نہیں تھی کہ وہ یوم حساب کے دن کا بادشاہ ہے۔ یعنی دونوں آیات سے دو باتیں مقصود ہیں۔
﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ میں گو دنیا و آخرت دونوں شامل ہیں لیکن اگلی آیت میں آخرت (یَوْمِ الدِّیْنِ) کے خصوصی ذکر سے گویا پہلی آیت میں دنیا کا خاص تذکرہ مقصود ہے۔ یہاں وہ تفصیل نہیں جو سورۃ القصص (آیت ۷۰) میں پائی جاتی ہے:

﴿لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۫﴾ (آیت ۷۰)

''اُسی کے لیے سب تعریفیں ہیں، پہلی (دنیا) میں بھی اور دوسری (آخرت) میں بھی۔''

اور اسی لیے سورۃ الفاتحہ کی دونوں قراءتوں سے اللہ کی دونوں صفات یعنی مالکیت اور بادشاہت کا اظہار ہو گیا۔ دنیا کی ربوبیت کا بھی اور آخرت کی بادشاہت کا بھی۔ برخلاف سورۃ آل عمران اور سورۃ الناس کی آیات کا، کہ وہاں ایک ہی آیت سے دونوں صفات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہیں۔ گو آیت ایک ہی ہے لیکن مطلق ہے مقید نہیں، اس لیے دونوں حالتوں (دارِ دنیا اور دارِ آخرت) پر حاوی ہے۔

اگر آپ یہاں یہ سوال کریں کہ اس سے تو یہ معلوم ہوا کہ آیت ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کا ایک خصوصی مفہوم ہے جو سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت سے بالکل جدا ہے، تو پھر یہ کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ سورۃ الفاتحہ کی یہ دونوں آیتیں، آل عمران اور الناس کی آیتوں جیسی ہو گئیں، یعنی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ مَلِك بھی ہیں اور مالك بھی، لیکن یہ مفہوم ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے کیسے نکلے گا؟

جواباً عرض ہے کہ ربّ العالمین اپنے عموم کے اعتبار سے ہر مخلوق کو شامل ہے، تو جو ہستی سب کی رب ہے اور مالک ہے تو پھر ہر مخلوق اس کی تابع ہے اور اس کی حدودِ ملکیت کے اندر اندر ہے، کیونکہ اللہ کے سوا اور کسی کی ملکیت ثابت نہیں۔ اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ چاروں آیات سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ ہی مَلِك ہے اور وہی مَالِك ہے۔ یعنی یہ بات تینوں آیات (الفاتحہ کی پہلی آیت اور آیت سورۃ آل عمران اور آیت الناس) کے مفہوم میں داخل ہے، لیکن ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ میں دونوں قراءتوں کا لحاظ کرنے سے سمجھ میں آتی ہے۔ گویا آیت ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾ اور آیت ﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾ میں اگر دوسری قراءت سے پڑھا جائے تو صرف تکرار ہو گی لیکن آیت (مالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ) میں دونوں قراءتوں کے لحاظ ہی سے مذکورہ مفہوم حاصل ہو گا۔ ❁❁❁

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝

وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝